مسئلہ کشمیر پر مقبوضہ کشمیر میں اُردو افسانہ

طاہرہ اقبال*

Abstract:

In occupied Kashmir Urdu afsana is clearly representing two different schools of thoughts. There are some who wrote on the topics related to political uncertainty, injustice, corruption, unemployment, curfew, agitation, enforcement of emergency oppression of police and army, rape, mission person and robberies. The prominent writers who have written thoughtful afsanas are Noor Shah, Trannum Riaz, Umer Majid, Manzoora Akhter, Zahid Mukhtar and Nikhat Nazar for instance Manzoora Akhter's two afsanas Pakiza Sahara and Jewan SAthi are depicting pictures of sentiment and agitation of Kashmiri Pundits. On the other hand Anad Lahar and Khalid Hussain's favorite topics covered the life of those people who are living near the boundary line. They deeply look into their feelings psychological/mental disturbances and fearful life. Majority of these writers are from Muslim Community.

Further Hindu writers like Wrander Patwari, Depik Kanwal, Depik Badki chose the topics which fully endorsed the status of Kashmiri Pundits, who are homeless and forced by the Indian army to vacate their native homeland. Their state of mind and feelings are fully covered by these writers.

وادیٔ کشمیر چونکہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔آزاد کشمیر کے چند نمائندہ اُردو افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کنٹرول لائن کے اُس پار جہاں اِدھر والوں کی قرابت داریاں،لسانی وتہذیبی رشتے، یادیں اور ماضی رہ گیا ہے اور جسے یہ مقبوضہ کشمیر کہتے ہیں، دیکھا جائے کہ بھارت کے زیرِ انتظام اس حصے کے اُردو افسانہ نگار کس انداز سے لکھ رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وادیٔ جنت نظیر

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد۔

کشمیر کے اُس حصے میں دہشت و وحشت کا راج ہے۔ یہاں کے باسی سماجی اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ اور عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ یہ ایک تباہ حال افراد کا بیمار معاشرہ ہے۔ جہاں ریاستی تشدد کے ردِّعمل میں چلنے والی حریت کی تحریکیں بھی مقامی افراد کے امن وسکون کو چھین چکی ہیں۔ آئے روز ہڑتالیں، جلسے جلوس، آنسو گیس، توڑ پھوڑ، لوٹ مار وہاں کا معمول بن چکا ہے۔ ہر سُو موت کے سائے دندناتے پھرتے ہیں۔ گھر بار، کاروبار، ملازمتیں، روزگار، عصمتیں کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہر طرف مایوسی، افراتفری اور ابتری پھیل چکی ہے۔ ایسے حالات میں لوگ نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ ان حالات کی جھلک معاصر اُردو افسانے میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بالخصوص وہ افسانہ نگار جو مقبوضہ کشمیر کے باسی ہیں اور ان حالات کو جھیل رہے ہیں، وہ اس وادیٔ جنت نظیر کے حسن کو گہنانے والے واقعات اور ان کے مختلف پہلوؤں کی جانب توجہ دلاتے رہتے ہیں کہ کشمیر دہشت گردی کی بدترین مثال بن چکا ہے۔ چنار جل رہے ہیں لالے جھلس گئے ہیں۔ حسین چہرے گہنا گئے ہیں۔ خوبصورت مناظر اور خوشگوار موسم راکھ ہو گئے ہیں۔ اس عمومی دہشت، خوف اور وحشت کے منظر نامے کے علاوہ بھی مسئلہ کشمیر کے کئی حوالے بنتے ہیں، جن پر اُس طرف کے کشمیری افسانہ نگاروں نے کئی افسانے رقم کیے ہیں۔ ایک اہم پہلو وادیٔ کشمیر سے محبت اور نسلی تفاخر ہے۔ یہ احساس نہ صرف کرشن چندر اور منٹو کے ہاں موجود تھا بلکہ بعد ازاں کشمیر سے تعلق رکھنے والے افسانوں میں بھی کشمیر سے محبت کا احساس شدت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار برج پریمی کے افسانوں میں یہ محبت رچی بسی ہے۔ اُنھوں نے کشمیر کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی بدحالی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اُنھیں بھی وادیٔ کشمیر سے ہجرت کا صدمہ سہنا پڑا۔ اس دوران اُن کی کئی کہانیاں ضائع بھی ہو گئیں بعد ازاں اُن کے بیٹے پریمی رومانی نے اُن کی باقی ماندہ کہانیوں کو ''سپنوں کی شام'' کے عنوان سے کتابی شکل میں مرتب کر دیا۔ اُن کے اسلوب پر کرشن چندر اور منٹو کے اثرات گہرے ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو انھی دونوں کا طوطی بولتا تھا اُن کا افسانہ ''شرنارتھی''، ہجرت کے عمل اور مہاجر کیمپوں میں روا رکھے گئے ناروا سلوک کو پیش کرتا ہے جس میں مصنف کا ذاتی تجربہ بھی موجود ہے۔ مظفر آباد کے نزدیک شرنارتھی کے گاؤں میں جنگجو قبائلی گھس آتے ہیں اُس کا باپ گاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی بوڑھی ماں کو کندھے پر اُٹھائے ہوئے نقل مکانی کرتا ہے اور بارہ مولہ پہنچتا ہے۔ رفیوجی کیمپوں میں اُسے قبائلیوں کی نسبت زیادہ وحشت ناک درندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ آخر ایک نام نہاد قومی خدمت گار سیٹھ اپنی آسٹن کار اُس کے اُوپر چڑھا دیتا ہے۔ وہ قبائلیوں کے ہاتھوں سے تو بچ نکلتا ہے لیکن شرنارتھی بن کر اپنوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ دیپک بدکی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر حامدی کشمیری کا ماننا ہے کہ برج پریمی کی کشمیریات سے وابستگی عشق کا درجہ رکھتی ہے اور وہ اس بسیار شیوہ موضوع کے بعض مستور پہلوؤں کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تانے بانے عموماً کشمیر کے ماحول میں بنے گئے ہیں۔ وہ یہاں کے مسائل سے واقف تھے یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مجبوریوں کو قلم کے حوالے کرتے تھے اور ان کا دِل کشمیری مزدور اور دہقان کے لیے دھڑکتا تھا۔''(۱)

ویریندر پٹواری سری نگر کشمیر میں ۱۱ ستمبر ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں دیگر پنڈت برادری کے ساتھ انھیں بھی کشمیر چھوڑنا پڑا، جس کا قلق اور کشمیر کی یادیں اُنھیں تڑپاتی رہیں۔ ایک کار حادثے میں قوتِ گویائی کا چھن جانا اور نوجوان بیٹی کی بے وقت موت نے اُنھیں مزید ہلا کر رکھ دیا لیکن اُن کے تخلیقی بہاؤ میں کہیں رُکاوَنہ آیا۔ اُنھوں نے دوسو سے زائد افسانے لکھے جو''فرشتے خاموش ہیں''،''دوسری کرن''،''بے چین لمحوں کا تنہا سفر''،''آواز سرگوشیوں کی''،''ایک ادھوری کہانی''اور''اُفق'' جیسے مجموعوں میں شائع ہوئے۔

ان کی بیشتر کہانیاں کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں اور کشمیر کے جاری مصائب کو موضوع بناتی ہیں وہ کشمیر میں چھائے جنگ اور دہشت کے ماحول کو خوشیوں اور امن میں بدلنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے اس سسکتی وادی کا کرب گھول کر اپنے افسانوں میں بھر دیا ہے۔ اس ضمن میں حقانی القاسمی رقمطراز ہیں:

> ''ویریندر پٹواری کی کہانی میں کشمیر کا درد نظر آتا ہے۔ اس زمین کا نوحہ، اس مٹی کا مرثیہ جو کبھی جنت تھی۔ مرغزار تھی، سبزہ زار تھی جس کی دل فریبی، رعنائی وزیبائی نے بادشاہوں کے دلوں کو مسخر کرلیا۔ باوجودیکہ پٹواری اور اس کی برادری کو ہجرت کی کٹھنائیاں سہنی پڑیں۔ اُنھوں نے سیکولرازم سے کبھی اپنا منہ نہیں موڑا اور رجائیت ان سے ہمیشہ دامن گیر رہی۔ ایک ادھوری کہانی کے انتساب میں وہ اپنے پوتے کارتک سے یوں ہم کلام ہیں:
>
> وہ صبح کبھی تو آئے گی/جب تم سنادوگے/اپنے بیٹے کو/چاہت کی کہانی محبت کی زبانی/ زندگی کی کہانی وقت کی زبانی/کھیتوں کی لہک پھولوں کی مہک/پرندوں کی چہک سروں کی دھنک/امن عالم کی زبانی!!''(۲)

ویریندر پٹواری کشمیر پر چھائے غم والم کے بادلوں کے چھٹنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ ہجرت کے بعد لکھے گئے اپنے افسانوں میں عصری آگہی کے سلگتے ہوئے احساس کو پیش کرتے ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں مثالیت یا مقصد کا کھلا اظہار نہیں ہے بلکہ ہر کہانی رمز وایما میں مستور ہے۔ کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی کہانیاں اگرچہ سلگتے ہوئے کئی تاریخی سوالات چھوڑ جاتی ہیں۔ بہرحال وہ امن کے متلاشی ہیں۔

جب ہم کشمیر کے دونوں حصوں میں لکھے گئے کشمیر ایشوز سے متعلق افسانے پڑھتے ہیں تو نظریاتی اختلاف اور تاریخی نقطۂ نگاہ واضح ہو جاتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی تحریکِ آزادی اور جہاد کے نظریے کو ادھر دہشت گردی کا نام

دیا جاتا ہے۔ سری نگر اور جموں سے نقل مکانی کے دُکھ کو بار بار چھیڑا جاتا ہے۔ انھی علاقوں سے نقل مکانی کر کے آزاد کشمیر آنے والے بھی ہجرت کا کرب سہتے ہیں اور اپنے آبائی علاقوں کی محبت درد بن کر اظہار پاتی رہتی ہے اُنھیں ریاستی دہشت گردی کا شکار ہونا پڑا اور بھارتی فوجیوں کے مظالم، قتل و غارت، لوٹ مار سہنا پڑی۔ گویا دونوں اطراف کے عوام، دُکھ اور مصائب کا شکار ہیں لیکن عالمی ضمیر بے حس ہو چکے ہیں یہ سیاست، سازشوں اور مفادات کی جنگ ہے جس کا ایندھن بے گناہ عوام کو بنایا جا رہا ہے۔

ویریندر پٹواری کا افسانہ ''آدم'' عوام کی اسی بے گناہی کو پیش کرتا ہے کہ آدم نے وصیت کی تھی کہ اُس کی لاش کو ایسے شخص کو سونپا جائے جو نسلِ آدم کی رنگ و نسل، مذہب و ذات پات سے بالاتر ہو کر پرورش کرے ورنہ کسی میڈیکل کالج میں دے دی جائے تا کہ اُس کے بچوں کو اس کی کچھ قیمت مِل سکے لیکن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس کی وصیت کے مطابق کوئی ایسا وارث نہیں ملتا۔

افسانہ ''سزا'' میں بھی ایک ایسے خاندان کو پیش کیا گیا ہے۔ جس نے ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں تین نسلیں وطن کی حفاظت کے لیے پیش کیں لیکن آج وہی خاندان خود دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ افسانہ ''سنگ چور'' میں سانپ نما دُشمن کا ذِکر ہے جو بظاہر خوشنما ہے۔ بباطن زہر سے بھرا ہے اور گاؤں کے امن کو مذہبی فرقہ پرستی کی بنیادوں پر بانٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار علامتوں کے توسط سے کشمیر میں پھیلے بدامنی کے عوامل کو پیش کرتا ہے۔ افسانہ ''سزا'' کا ہالکل کشمیری پنڈت کا اِستعارہ بنتا ہے۔ ''دھواں'' تخریب اور توڑ پھوڑ کی علامت ہے۔ دُھند، خبرداری اور چوکسی کی علامت بنتی ہے، ویریندر پٹواری نے جانوروں کو اُن کے جبلی خصائص کے حوالے سے بھی علامتیں بنایا ہے۔ مثلاً چیونٹی، سانپ، کتا، چیل اور ریچھ وغیرہ۔ افسانہ ''ریچھ'' میں انسان کی خوں ریزی کو دیکھ کر ریچھ شرمسار ہو جاتا ہے۔

ان کے ہاں مذہبی تعصب نہیں ہے لیکن اُن کا دُکھ کشمیری عوام کے حقوق کی پائمالی و غاصبیت کا دُکھ نہیں بلکہ ہجرت کا تجربہ اُن کا دُکھ ہے جس سے خود ذاتی طور پر وہ دوچار ہوئے اور کشمیر میں ہندو پنڈتوں پر زندگی تنگ ہو گئی اور اُنھیں کیمپوں اور اجنبی شہروں میں پناہ لینا پڑی اُن کے افسانوں کا یہی تخلیقی کرب ہے کشمیر سے متعلق اُن کا سیاسی نقطۂ نظر افسانہ ''قیدی'' میں یوں بیان ہوا ہے۔

> ''پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اچھا انسان نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان ہوتا ہے مگر بُرا انسان ایک شیطان ہوتا ہے۔ شیطان ایک طوفان ہوتا ہے جو بھائی کو بھائی سے جدا کر کے اپنے مقصد کی خاطر دونوں کو قربان کر دیتا ہے۔''(۳)

ان کے افسانوں میں پچھلے پندرہ بیس برس میں کشمیر میں جاری تحریکِ آزادی کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ ''ڈر'' میں چیونٹی کے توسط سے اپنے کرب کو یوں پیش کیا ہے :

> ''مگر کچھ نہیں کر سکتی نا! ہاں اگر وہ ہاتھی جتنی بڑی ہوتی تب بات اور تھی۔اُف اُف!! وہ ہاتھی جتنی کیوں نہیں ہے! یا پھر ظلم وستم کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے ہاتھ میں تلوار، تیر کمان یا بندوق کیوں نہیں ہے۔''(۴)

کشمیر سے متعلق اُن کا مطمحِ نظر امن کی تلاش ہے۔اس خواہش میں وہ حریت پسندوں اور قابض فورسز دونوں کو قصوروار سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں کی کارروائیوں سے نقصان عام انسان کا ہو رہا ہے۔اُن کے افسانوں میں زیریں لہروں کی طرح اُبھرتا کرب دراصل اُن اُکھڑے ہوئے لوگوں کا ہے جنھیں جانیں بچانے کی خاطر اپنے گھر اور گلی کوچوں کو خیر باد کہنا پڑا۔اپنی ایک نظم ''کب بھور ہوگی'' میں کشمیری مہاجرین کا ایک دِلگداز منظر یوں پیش کرتے ہیں :

> ''چاروں اور سناٹا چھایا تھا/اور سناٹوں میں کھویا ہوا تھا/ایک شہر بے چراغ/ہر سڑک ویران/ہر گلی سنسان/خاموش در و دیوار/نشید کھڑکیاں/اور خالی خالی گھر/گھر والے/ دُور کہیں/ٹینٹوں میں/چھپ کر بیٹھے تھے/ایک ٹینٹ میں/سہمی سہمی/میری ماں تھی/ مجھے دیکھ کر/ماں پہلے ہنس پڑی/اور پھر رو پڑی''

اگرچہ یہ منظر کشمیری مہاجر پنڈتوں کے کیمپ کا ہے لیکن یہی منظر مسلمان کشمیری مہاجروں کے کیمپوں کا بھی تو ہے۔ ویریندر پٹوری کے افسانوں میں موجود، دہشت ناک ماحول، مہاجرت کے دُکھ، وطن سے دُوری کی تڑپ، مسلمان مہاجروں کے ہاں بھی ویسی ہی ہے۔مصنف نے چونکہ یہ کہیں نہیں لکھا کہ اُن کا مقصود مظالم کا شکار ہندو پنڈتوں کی ہجرتوں اور دُکھوں کا اظہار ہے اس لیے یہ افسانے مجموعی طور پر کشمیر میں چھائے دہشت و وحشت کے ماحول کے لیے یکساں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔وہ چاہے بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں لٹنے والی کشمیری لڑکیاں کہ خانماں برباد مسلمان گھرانے ہوں یا ردِّعمل کے طور پر بے گھر کر دیئے گئے ہندو پنڈت ہوں لیکن ایک بات قابلِ غور ہے کہ جس شدت اور تخلیقی کرب اور کثرت سے ہندو کشمیری ادیبوں نے لکھا ہے تاریخی وعدہ خلافی اور سیاسی اجارہ داری کا شکار ہونے کے باوجود مسلمان کشمیریوں کے ہاں اس موضوع کو اُس تخلیقی وفور کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا۔معیار اور مقدار دونوں میں کنٹرول لائن کے ادھر لکھا جانے والا افسانہ اُدھر لکھے جانے والے افسانے کا مقابلہ نہیں کرتا۔ادھر مثالیت اور مقصدیت فن پر غالب آ جاتی ہے۔ذو معنویت، علامت نگاری، رمز و ایمائیت کی فن کاری میں تاریخی سچ کو تخلیقی رچاؤ کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکا، جیسا کہ ویریندر پٹواری کے ہاں موجود ہے۔اسی لیے کشمیر کی تاریخی اور سیاسی صورتِ حال کو اپنے مؤقف کے مطابق بیان کرنے کے باوجود ان افسانوں کا فنی درجہ

برقرار رہتا ہے اور افسانہ نگار پر کسی جانب داری کی گرفت بھی نہیں ہوسکتی بلکہ دونوں فریق اپنے اپنے مؤقف کے لیے انھیں مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ کسی افسانے کی بڑی خوبی ہوتی ہے کہ اُس کے رموز وعلائم ایک جہاں معنی رکھتے ہوں اور اُس کی مختلف پرتیں متضاد نظریات کے حامل لوگ اپنے اپنے خیال کی وضاحت کے لیے پیش کریں۔ ویریندار پٹواری کا علامتی اسلوب اُنھیں مثالیت ومقصدیت کا شکار نہیں ہونے دیتا ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس پوری طرح اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ اُن کا فن کشمیر میں عافیت اور امن کی تلاش کا مسلسل عمل ہے۔ اس ضمن میں نور شاہ رقم طراز ہیں:

> ''ویریندر پٹواری نے پچھلے کچھ برسوں سے جو کہانیاں تخلیق کی ہیں ان میں درد و کرب کی ایک عجیب سی فضا نظر آتی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ افسانے وادیٔ کشمیر کی مٹی میں موجود خوشبو سے معطر ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے کشمیر کے موجودہ غم زدہ ماحول کو خوشیوں میں بدلنے کے خواہاں ہیں۔''(۵)

کشمیر کے موضوع پر لکھنے والوں میں دیپک بدکی کا نام بھی بڑا اہم ہے۔ ۸فروری ۱۹۵۰ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہونے والے دیپک بدکی کے افسانوی مجموعے ''ادھورے چہرے'' اور ''چنارے کے پنجے'' طبع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''۲۸ فروری سے گجرات کے حالات فرقہ ورانہ فسادات کے باعث بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ۱۹۸۹ء میں اپنے آبائی وطن کشمیر میں تھا کہ وہاں بھائی بھائی کا دُشمن ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں خالی ہوگئیں وہاں کشمیری ہندو اقلیت میں تھے اس لیے اُنھیں وہاں سے نقل مکانی کرنا پڑا پھر یہاں یروڈو پوسٹنگ ہوئی بڑی ہی شانت جگہ تھی لوگ امن پسند اور شریف الذات تھے۔ یکا یک نجانے کیا ہوا کہ چاروں طرف آگ لگ گئی۔ مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر راحت کیمپوں میں جمع ہو گئے وہ تھا مسلمانوں کا جبر (کشمیر) اور یہ ہے ہندوؤں کا جبر (گجرات) آپ ہی بتلائیے کہ کسے تہذیب یافتہ کہیں۔''(۶)

دیپک بدکی نے ملکی اور عالمی، سیاسی، تاریخ کے اہم واقعات وحوادث پر رمزیہ وعلامتی اسلوب میں اچھے افسانے تحریر کیے۔ بدکی کے بیشتر افسانوں کے مطالعہ کے بعد اُن کا سیاسی نظریہ اور اخلاقی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ فرقہ ورانہ فسادات کو، دہشت گردی کو، سیاسی سٹنٹ سمجھتے ہیں۔ ان کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں کچھ پوشیدہ ہاتھوں میں ہوتی ہیں اور ان پوشیدہ قوتوں کے آلۂ کار دراصل محض ''ٹول'' ہوتے ہیں جن کا واسطہ نہ ہی کسی مذہب سے ہے نہ وطن اور زمین سے اور نہ ہی انسانیت سے، کشمیر کے پس منظر میں اُن کی کہانی ''نہتے مکان کا دیپ'' ایک اچھی کہانی

ہے جس میں ایک خالی مکان کا استحصال دکھایا گیا ہے۔ یہ وہ منظر نامہ ہے جو کشمیر کے جبر واستحصال کی علامت بنتا ہے۔ کشمیر کے حالات سے جانیں بچا کر چھ افراد پر مشتمل ایک پنڈت خاندان رات کے اندھیرے میں اپنے مکان کو تالا لگا کر پناہ کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ ہر شخص حسرت بھری نگاہوں سے تالے کو دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ کاش یہ تالا خود بہ خود ٹوٹ جاتا اور آپ ہی آپ کھل جاتا۔

کچھ دنوں بعد ایک خونخوار دہشت گرد تالا توڑ کر گھر میں گھس گیا۔ اُس نے الماریوں، صندوقوں، اٹیچی کیسوں کی تلاشی لی لیکن اُسے زیورات اور پیسے نہ ملے۔ البتہ وہاں دیوی دیوتاؤں کی تصویریں سجی ہوئی تھیں۔ اُس نے ایک موٹی سی گالی دی اور وہاں سے نکل گیا۔ اگلے روز یہ خبر پھیلی کہ اندر آتنک وادی چھپا ہوا ہے۔ سکیورٹی فورسز نے گھر کو چاروں اطراف سے گھیر لیا اور بے تحاشا گولیاں چلائیں لیکن جوابی کارروائی کوئی نہ ہوئی تو اندر گھسے۔ بے بس مکان گولے باری سے چھلنی ہو گیا تھا اپنے زخم زخم وجود کے کرب کا اظہار اپنی بے زبانی سے کر رہا تھا۔ سکیورٹی فورسز نے کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہاں کوئی چھپا ہوا نہ تھا، پھر بھی سبھی ٹرنک الماریوں کا سامان اُلٹ پلٹ دیا۔ صندوقوں میں سے ساڑھیاں یوں باہر اُبل رہی تھیں جیسے ذبح ہوتے بکرے سے انتڑیاں باہر نکل رہی ہوں۔ اب مکان کے سب کھڑکیاں دروازے کھل گئے تھے۔ اس لیے جی بھر کر اُسے لوٹا گیا کچھ بھی نہ چھوڑا گیا۔ اس مکان کی حالت ایسی دوشیزہ کی سی لگ رہی تھی جسے کئی غنڈوں نے مِل کر اُس کی عصمت تار تار کر دی ہو اور پھر خون میں لت پت اس کے نیم مردہ جسم کو سرِ راہ چھوڑ گئے ہوں۔

مکان میں اب کچھ نہ بچا تھا لیکن ایک پڑوسی کی نظر دیودار سے بنی ہوئی کھڑکیوں، دروازوں پر پڑی تو وہ انھیں نکالنے میں جٹ گیا۔ سب چیزیں نکالنے کے بعد رات کے اندھیرے میں مکان کو آگ لگا دی گئی جب آگ پھیلنے لگی تو اردگرد کے لوگوں کو اپنے اپنے مکانوں کی فکر لاحق ہوئی سو وہ پانی کی بالٹیاں بھر بھر آگ بجھانے لگے۔ آگ بجھنے کے بعد بھی کوئی چیز اگر بچ رہی تھی تو وہ یہ آگ بجھانے والے اُٹھا کر لے گئے اور وہ آشیانہ جو تنکا تنکا جوڑ کر بنایا گیا تھا راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

یہ کہانی کشمیر کے باسیوں کی زندگی کے استیصال کو پیش کرتی ہے اس کی علامتی جہت اُسے پنڈتوں کی بے گھری، بے دری اور اُن کی املاک کی لوٹ مار سے اُوپر اُٹھا کر وادیٔ کشمیر کے پورے استحصالی نظام کی نمائندہ بنا دیتی ہے۔ گویا اس خطۂ جنت نظیر کو آتنک وادیوں کی آڑ میں ہر طبقے اور فریق نے لوٹا۔ اس طرح جیسے یہاں کی دوشیزاؤں کی عصمت کو تار تار کیا گیا اور بے گناہوں کا قتلِ عام کیا گیا وہ اپنے اکثر افسانوں میں کشمیر میں ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر، استحصال و زیادتی پر ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے لیکن یہ بھی

انسانی فطرت ہے کہ جنم بھومی سے جدائی اور مہاجرت میں اس کی یاد زیادہ ستاتی ہے۔ ''گاڑی کا انتظار''، ''ایک دو تین''، ''کئی گاندھی''، ''گھونسلا'' جیسے افسانوں میں موجود زندگی کی بے ترتیبی اور سماجی ڈھانچے کی تباہی کو اُنھوں نے پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔

''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'' افسانے میں ایک ایسے بزرگ کے احساسات کی عکاسی ہے جو نقل مکانی پر مجبور ہوا وہ کشمیری پنڈت ہے جسے ۱۹۸۹ء میں کشمیر سے جبری انخلا کرنا پڑا لیکن کشمیر کی محبت وہ کبھی ترک نہ کر سکا۔ وہ حیران ہے کہ آخر اُس کا حقِ سکونت یکدم ختم کیسے ہو گیا۔ سلطانہ مہر لکھتی ہیں :

> ''کشمیر کا باسی افسانہ نگار دیپک بدکی تو بس ایک افسانہ نگار ہے جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ ہی عیسائی اُس کا دِل مظلوم کے دُکھ پر تڑپتا ہے۔ انسانیت پر ظلم و بربریت دیکھ کر اُس کی آنکھیں خون بھرے آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔''(۷)

سیّدہ نسرین نقاش لکھتی ہیں :

> ''دیپک بدکی کی لگ بھگ سبھی کہانیاں حقیقت پر مبنی ہیں وہ کچلے ہوئے اور خوف زدہ انسانوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنائے مسخ چہروں کو اپنے قلم سے حقیقی خدوخال دینے میں مصروف ہیں۔ وہ ہونٹ جو جبر و استحصال کے اندھیروں میں اپنی مسکراہٹ اور دلکشی کھو چکے ہیں وہ ان کے لیے البیلی ہنستی گاتی زندگی کے خواہاں ہیں جہاں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو محبت ہی محبت ہو۔''(۸)

افسانہ ''جاگو'' ایک تجریدی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں حکمران طبقے کی فرعونیت اور وادی میں لاگو کی گئی ایمرجنسی کے خلاف احتجاج ہے۔ افسانے کا راوی موسیٰ خدا سے ہم کلام ہے اور پس منظر میں دُنیا کے ہنگامے پورے زور و شور سے جاری و ساری ہیں۔ لاؤڈ اسپیکروں کی آوازیں، اسکولوں کی گھنٹیاں، مشینوں کا شور اور سب پر چھائے ہوئے ہندو مسلم، سکھ، عیسائی گروہوں کی فرقہ ورانہ نعرہ بازیاں غرضیکہ کان پھاڑنے والا شور اور ہنگامہ برپا ہے۔ یہ ہنگامہ گناہ و معصیت کا ہے۔ خونریزیوں اور فرقہ واریت کا نتیجہ ہے لیکن لوگ ہیں کہ گناہ کیے چلے جا رہے ہیں کیونکہ اُنھیں اُمید ہے کہ آخر کار خدا انسانوں کی بخشش کر دے گا۔ توبہ کی اُمید پر گناہ کیے چلے جا رہے ہیں گویا توبہ پریشر ککر کے سیفٹی ویلو کا کام کرتی ہے۔

دیپک بدکی حساس فنکار ہیں اور بنیادی طور پر وہ عدم تشدد کے پرچارک ہیں۔ اُنھوں نے عراق پر امریکہ کی جارحیت پر بھی افسانہ ''معصوم علی'' لکھا۔ خود ہندوستان میں فرقہ واریت اور تشدد پسندی پر متعدد افسانے رقم کیے۔

''دیپک بدکی کے تمام نظریاتی افسانے اگر ایک سطر کا مرکزی خیال ظاہر کرنا چاہیں تو

وہ یہ ہے کہ تشدد کی راہ پر چل کر انسان سراسر خسارے میں ہے۔ فلسفۂ عدم تشدد اور غیر تعصبی رویے کے سبب انھیں پوری دُنیا میں پذیرائی ملی۔''(۹)

یہاں یہ اَمر قابلِ غور ہے کہ ان ہندو کشمیری افسانہ نگاروں کے ہاں بے تعصبی، رواداری اور عدم تشدد کا نظریہ غالب ہے اور وہ کشمیر کو پُرسکون، بے تعصب خطہ اور امن کا گہوارہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں لیکن بدامنی، بے سکونی اور بے تعصبیت پیدا ہونے کی جو بنیادی وجہ ہے اُس کا ذِکر کہیں نہیں ملتا۔ یعنی کسی سے اُس کی زمین مادرِ وطن، آزادی اور حرمت چھیننے کے بعد یہ توقع بھی رکھی جائے کہ وہ محض عدم تشدد کا پرچارک بن کر رہ جائے گا، یہ کیسے ممکن ہے، بہت سے افسانے ہندووانہ ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر لکھے جا رہے ہیں جو یک طرفہ سوچ اور مؤقف کے حامل ہیں، تنازعہ کی اصل جڑ پر لکھنے والے بہت کم ہیں۔ شاید سیاسی وابستگیاں اور ریاستی خوف پیشِ نظر ہوگا کہ اس سنگین مسئلے کو خاص اینگل اور سرسری نظر سے دیکھا گیا اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر ہی توجہ دی گئی، البتہ سری نگر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار ''نور شاہ'' اپنے افسانوں میں ان سوالوں کا کسی حد تک جواب دیتے ہیں اگرچہ دستورِ زباں بندی یہاں بھی حاوی ہے لیکن علامتی اور استعاراتی انداز میں کشمیر کے مخدوش حالات اور غیر یقینی مستقبل کی جانب اِشارہ ضرور ملتا ہے جس میں اُمید کا رنگ اور آزادی کی اُمنگ موجود ہے۔ ان کا افسانہ ''اس کمرے کی کھڑکی سے'' گویا کشمیریوں کے نوشتۂ تقدیر کا ایک ورق ہے یہ انتہائی عمدہ افسانہ ہے۔ دو قیدی ایک ہسپتال کے کمرے میں علاج کی غرض سے لائے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف بیرکوں سے ہے جو اپنے ناموں کی بجائے نمبروں سے پکارے جاتے ہیں اور اپنی شناخت جیل کے بخشے گئے انھی نمبروں سے کرواتے ہیں۔ ہسپتال میں کھڑکی کے قریب جس قیدی کا بیڈ ہے وہ خوش قسمت سمجھا جاتا ہے۔ ساتھی قیدی اُس سے کھڑکی کے پار دُنیا کے رنگوں اور کشمیر کے حسین مناظر اور کھلی فضاؤں کے متعلق استفسار کرتا ہے وہ جواباً اُسے بتاتا ہے کہ کھڑکی کے پار چنار کے درخت، ہرے پتوں سے لدے ہوئے ہیں جن کی گہری چھاؤں ہے یہاں خوبصورت بچے اور بچیاں کھیل رہے ہیں۔ رنگ برنگ پھول کھلے ہیں آسمان کی بلندیاں نظر آ رہی ہیں اور نیچے برف پوش پہاڑ بچھے ہیں اور وہ اس کھڑکی سے ان سبھی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

جب وہ قیدی مر جاتا ہے تو دوسرا قیدی بڑی فرمائشوں کے بعد کھڑکی کے پاس والے بیڈ پر منتقل ہوتا ہے، وہ بڑی حسرتوں اور اُمنگوں کے ساتھ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے تو اُس کی خوفزدہ نگاہیں زبان کو گنگ کر دیتی ہیں۔ اُس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے کیونکہ۔۔۔ وہاں ایک سنگی دیوار کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

''وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ نہ پھول تھے اور نہ ہی سرسبز پتے، آسمان تھا اور نہ ہی برف پوش پہاڑ۔۔۔ بادل تھے اور نہ ہی دھوپ کی ہلکی لکیر۔۔۔ نہ کوئی بچہ اور نہ کوئی بچی۔ وہاں ایک دیوار تھی۔۔۔ کھردرے پتھروں سے بنی ایک خستہ دیوار؟!''(۱۰)

یہ افسانہ اپنے اختتام پر قاری کو ہلا کر رکھ دیتا ہے آزادیٔ کشمیر کا خواب دیکھنے والے اس قیدی نے مرتے مرتے جس منظر کو بند کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ اُس خواب کو تو وہاں دیکھنے پر پابندی عائد ہے۔ ان آزاد مناظر اور قیدی آنکھوں کے درمیان سنگلاخ دیواریں حائل ہیں لیکن وہ قیدی سنگی پتھروں کی دیوار کے اُس پار کے روشن مناظر کو دیکھنے کا متمنی ہے گویا یہی خواب کشمیریوں کی محکوم آنکھوں پر طلوع ہو رہا ہے۔ دراصل یہ افسانہ ایک علامتی جہت سامنے لاتا ہے کہ یہ وادی جو پھولوں، رنگوں، خوشبوؤں اور دِلکش نظاروں سے سجی تھی آج یہ سب بھسم ہو چکا ہے۔ آج ان مناظر کی خواہش رکھنے والوں کی بینائی سنگی منظروں سے پتھرا چکی ہے تو پھر اندر کی ایک آنکھ کھلتی ہے جو یادوں کے دِیپ جلاتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے جو ہونا چاہیے لیکن نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ نور شاہ، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے رومانوی دبستان کے علمبردار ہیں اور حسن، سکون اور امن کے متلاشی ہیں لیکن کیا کریں کہ اس حسن اور سکون کی وادی سے امن چھین لیا گیا ہے۔ افسانہ لکیریں کا یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

> ''اور پھر دیکھتے دیکھتے پُرسکون ماحول ایک بے حد ڈراؤنے اور بدصورت رُوپ میں بدل گیا۔ ابھی ابھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ ہر سمت ہل چل تھی۔ ایک بھرپور زندگی تھی۔ زندگی کی رُوح پرور رعنائیاں تھیں۔ آسمان کی وسعتوں میں سورج ہنس رہا تھا اور پھر قریب میں کوئی شے پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ جیسے دھویں کے کثیف بادل اُٹھ اُٹھ کر بکھر گئے ہوں ہواؤں کی تھرکتی لوریاں خاموش ہو گئی ہوں اور پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بکھر گئیں۔ بچاؤ اور بچاؤ کی آوازیں اُبھرنے لگیں، سورج کی ہنسی جیسے اَن دیکھے لمحوں کے شور میں گم ہو گئی۔''(۱۱)

نور شاہ کشمیر کے حسین مناظر کا شیدائی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے افسانوی مجموعے بےثمر بیج میں لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ جگہ (کشمیر) ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے کہنا یہ ہے کہ وادی کے اس حصے میں میری احساسِ جمال کی پرورش ہوتی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہوتا ہے۔''(۱۲)

رومانیت، رجائیت پسندی، انسان دوستی اور بے تعصبی و رواداری (سیکولرازم) ان کے فن کے بنیادی عناصر ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اُن کے اردگرد جو زندگی پھیلی ہے وہ دہشت، خوف، غلامی اور تشدد کا شکار ہو چکی ہے۔ بے اعتمادی اور شکوک وشبہات کا دور دورہ ہے۔ عام سادہ لوح افراد کو دہشت گرد اور مخبر قرار دے کر قتلِ عام کیا جا رہا ہے۔ سماجی مسائل کو بھی سیاسی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ اس موضوع کی مثال اُن کا افسانہ ''وہ جو ایک شخص تھا'' کا خان بابا ہے جو اپنی نوعمر بیوی کو اس شک میں مار ڈالتا ہے کہ شادی سے پہلے وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ اس

احساسِ گناہ میں وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور رات بھر کہیں غائب رہتا ہے پولیس اور ملی ٹینٹ دونوں اُس پر الزامات لگاتے ہیں اور آخر اُسے بے دردی سے مار دیا جاتا ہے۔ ملی ٹینٹ اُسے مخبر قرار دیتے ہیں جب کہ پولیس اُس پر ملی ٹینٹ کا لیبل چسپاں کر دیتی ہے۔ کشمیر میں موجود سیاسی فضا کو اس افسانے کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

افسانہ ''ٹوٹتے لمحوں کا بیان'' میں اُنھوں نے ایک ایسے فوجی کا کردار پیش کیا ہے جو کسی دوسرے ملک کا امن بحال کرنے کے لیے (Peace keeping force) کے ہمراہ باہر چلا جاتا ہے، جب اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے بعد واپس اپنی وادی میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہاں تو اُس سے بھی زیادہ بدامنی پھیلی ہوئی ہے وہ اپنی ریاست کی خستہ حالت دیکھ کر نہایت شرمندہ ہوتا ہے اور اُس کا ضمیر مطمئن نہیں ہوتا۔ وردی کے تقاضے کچھ بھی ہوں لیکن ضمیر کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں جسے سمجھانے میں وہ قاصر رہتا ہے۔

> ''اُن کے افسانے پہاڑی زندگی کے مصائب کے عکاس ہیں کہ کس طرح اس ہنستی گاتی وادی کو۔۔۔اس کے عام سادہ لوح افراد کو دہشت گرد یا مخبر قرار دے کر امن و امان کو تباہ کیا جا رہا ہے۔۔۔نور شاہ کی اکثر کہانیاں پڑھ کر اس بات کا بخوبی احساس ہو جاتا ہے کہ نور شاہ فکری و جذباتی اعتبار سے کبھی کبھی ایک باغی کی طرح ہی ظلم و بربریت کے خلاف ایک ہاتھ میں پرچم اور دوسرے میں ادب کی قندیل لیے نظر آتے ہیں۔'' **(۱۳)**

نور شاہ وادی کی برہنہ سچائیوں کو بیان کرتے ہوئے مصلحت اندیشی کا دامن نہیں پکڑتے بلکہ سچ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں چاہے وہ سچ کتنا ہی بے ثمر کیوں نہ ہو۔ اسی لیے اس ''بے ثمر سچ'' میں تلخی بھی ہے اور قوت بھی جو تخلیقی سلیقے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس انگار وادی پر لکھنے والوں میں ایک اہم نام دیپک کنول کا ہے جن کے مجموعہ ''برف کی آگ'' میں چودہ افسانے شامل ہیں اور سبھی کشمیر کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر میں رواداری اور یگانگت کی خواہش ملتی ہے وہ تحریکِ آزادی کشمیر اور ریاستی دہشت گردی کے لبادے میں چھپی کئی سماجی خرابیوں کا بھی ذِکر کرتے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ ذاتی دُشمنیوں کا انتقام لینے کے لیے دہشت گردی کا ڈرامہ بھی رچاتے ہیں۔ کچھ غلط راہنمائی کی وجہ سے تاریک راہوں کی سمت نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ بیشتر افسانے وہاں جاری خونریزی اور تشدد پسندی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے ''پمپوش'' کے دیباچے میں سیفی سرونجی لکھتے ہیں:

> ''ظاہر ہے کہ اُن کا تعلق کشمیر سے ہے جسے کبھی ہندوستان کی جنت کہا جاتا تھا جہاں چاروں طرف خوشحالی تھی ہر طرف پھول کھل رہے تھے۔ سیلانیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ اس کشمیر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی کہ جہاں بہاریں ہی بہاریں تھیں اب وہاں آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ کلیاں مرجھا گئی ہیں

بہارخزاں میں بدل گئی ہے۔۔۔ایک خوف ہر دِل پر چھایا ہے بھائی بھائی کا دُشمن ہو
گیا کسی کی زندگی محفوظ نہیں رہی۔سیکڑوں لوگ ہجرت کر کے اپنے پیارے وطن کو
خیر باد کہہ کے روزگار کی تلاش میں نکل گئے۔''(۱۴)

اس مجموعے میں بھی کشمیر کی یادیں، اپنا چھوڑا ہوا گھر، ہجرت کا کرب پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ موجود ہے کبھی ''سنتا کی گوری''میں کبھی ''میں تو کبھی''، میں کبھی ''مرغی چور''، ''مچھی والی''، ''پمپوش''میں وادیٔ کشمیر کا کرب جاگزیں ہوتا ہے۔

پمپوش میں ''فردوستہ ایک پھول بیچنے والی لڑکی ہے۔اس کے پھول پمپوش سب سے زیادہ مندروں کے پجاری خریدتے ہیں انھی پجاریوں میں ایک مادھو جوتھا جس کی صورت اُس کے دادا سے ملتی تھی وہ اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا۔ فردوستہ کی شادی ہوئی تو شوہر شرابی اور نکما ملا۔وہ اُس پر روز ظلم ڈھاتا آخر ایک روز وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا دو سال کسمپرسی اور فاقہ کشی میں گزارنے کے بعد فردوستہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے پھر پھولوں کا ٹوکرا اُٹھا لیتی ہے لیکن اُس پر کھلتا ہے کہ اب پھول خریدنے والے یہاں نہیں رہے کیونکہ اب کشمیر اور اُس کے پھول مرجھا چکے ہیں۔کشمیری پنڈت ہجرت کر چکے ہیں وہ مادھو جی کی تلاش میں مندر میں جاتی ہے تو سی۔آر۔پی کے جوان اُس پر بندوقیں تان لیتے ہیں۔پجاری اُسے بچاتا ہے اور پوچھتا ہے:

''تم اس مندر میں کیسے آ گئی ہو بہن
وہ جو مادھو جو اندر بیٹھا ہے نا میں اُس سے ملنے آئی ہوں۔۔۔تمہیں بھرم ہوا ہے بہن۔
مادھو جو یہاں کہاں ہوسکتا ہے۔اُسے تو مرے ہوئے ایک سال ہوگیا۔۔۔
''نہیں''وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی اور پھر سختی سے بولی۔
تم جھوٹ بول رہے ہو۔مادھو جو کبھی مر نہیں سکتا۔وہ اندر بیٹھا ہوا ہے۔میں نے خود اُسے
اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اس طرح مجھ سے پمپوش لیے بنا کیسے جاسکتا ہے۔وہ
اگر چلا گیا تو پھر اس وادی میں پمپوش کبھی نہیں کھل پائیں گے کبھی نہیں۔''(۱۵)

ان کے ایک افسانے تفتیش کی دو لائنیں ملاحظہ کیجیے:

عصمت لٹی بلقیس کا خاوند شہباز انصاف سے مایوس ہو کر خدا سے فریاد کرتا ہے۔
''واہ رے مولا وہ (جہادی) کہتے ہیں کہ ہم فوج کی مخبری کرتے ہیں اور یہ کہتے
(پولیس) ہیں کہ ہم اُن کی مخبری کرتے ہیں مولا اب تمہارا ہی سہارا۔تو ہی مدد کر۔''

افسانہ ''بانگی مرغا'' ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں مرغا فروش ایک بانگی مرغا ایک سکھ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جس پر گل چرسی کہتا ہے:

''ہائے رے ظالم یہ تو نے کیا کیا۔ایک پرہیزگار مرغے کو ایک کافر کے ہاتھ بیچ دیا۔

اُس کم بخت نے اُس مظلوم کو ایک جھٹکے میں مار ڈالا ہوگا۔''(۱۶)

آخر کاشی وسکی اور گل چرسی مسلمان مرغے کو پپو سنگھ سے لینے پہنچتے ہیں تو وہ فخریہ کہتا ہے :

''او جی وہ مرغا تو بڑے کمال کا ہے سویرے سویرے حب میں سور ہا تھا تو وہ میرے کمرے میں آ کر بانگ دینے لگا اوئے مالکو مزے کی بات سنو اُس کی بانگ دینے کی دیر تھی کہ بغل والے گوردوارے سے گرو گرنتھ صاحب کا پاٹھ شروع ہوا مجھے لگتا ہے کہ وہ مرغا سکھ ہے جبھی تو اُس نے گرنتھ صاحب کا پاٹھ شروع ہونے سے پہلے ہی بانگ دے دی۔''(۱۷)

سادہ لوح افراد کے اندھے عقائد کو جس طرح سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اس افسانے میں اس تلخ حقیقت کا بخوبی بیان ہوا ہے۔ان کا افسانہ ''سنتا کی گوری'' کمال کا افسانہ ہے۔

''سنتا سنگھ کا گھر لائن آف کنٹرول سے بالکل سٹا ہوا تھا۔بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ گاؤں سرحد سے چار ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔سرحد پر رہنا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔اس کا ثبوت وہ گولیوں کے نشان تھے جو اس چھوٹے سے گاؤں کے ہر مکان کے سینے پر چیچک کے بدنما داغوں کی طرح نمایاں تھے۔آئے دن کی گولہ باری نے اب تک کئی قیمتی جانیں لی تھیں۔''(۱۸)

لیکن کہانی میں مرکزی کردار ''گوری'' (گائے) کا ہے جو چرتے ہوئے سرحد کے دوسری طرف چلی جاتی ہے۔سنتا سنگھ کا گائے کی جدائی میں بُرا حال تھا۔اُسے وہم تھا کہ اُس پار والے گوری کو ذبح کر دیں گے۔گوری کی یاد اُسے لہولہورُلا دیتی تھی۔آخر ایک سال کے بعد ایک روز گوری واپس گھر آ جاتی ہے۔سب گھر والے اُسے گلے لگا لگا کر مِل رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے کہ تبھی گائے کے پیچھے کھڑے اُس کے بچھڑے پر اُن کی نظر پڑی تو سنتا سنگھ تو غصے سے پاگل ہو گیا۔

''پرمیتے! یہ حرامی دا پتر کتھوں آ گیا؟

پرمیت بچھڑے کی طرف وارفتگی سے دیکھ کر بولی۔

آیا کتھوں۔یہ ''اسی دا جنا ہے جی'' کہہ کر وہ اُسے پیار کرنے لگی۔

سنتا کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ غصے سے اُبل کر بولا۔یہ ایتھے نہیں رہ سکدا یہ دُشمن کا پلا میرے کار وچ کدی نہیں رہ سکدا۔۔۔میں اس حرام دی اولاد کو اپنے کار وچ رہنے نہیں دوں گا۔''(۱۹)

وہ اُسے لاتیں مار کر اور کان سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سرحد پر چھوڑ آتا ہے لیکن گھر آ کر دیکھتا ہے کہ گوری کی بچھڑے سے جدائی میں بُری حالت ہے وہ رات بھر بولتی رہی اور سنتا کی بیوی اُسے پھٹکاریں سناتی رہی۔

''وہ پرمیت سے نظریں چراتے ہوئے گوری کی طرف بڑھا اور پھر اُسے پیار کرتے ہوئے بولا۔

تیرا بچھڑا تیرے قول واپس آ جائے گا یہ سردار سنتا سنگھ داوعدہ ہے تیرے نال۔''(۲۰)

بچھڑا سرحد کی اُس اور چلا گیا تھا جہاں سے واپس لانا اُس کے بس میں نہ رہا تھا۔ سنتری اُسے سمجھاتے ہیں:

''دیکھ پراوہ دُشمن دا علاقہ ہے تو نے اگر اُس اور پاؤں بھی رکھ دیا نا تو وہ تم پر سیدھے گولی چلا دیں گے۔''(۲۱)

لیکن سنتا قول ہارنا نہ چاہتا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں سرحد پار کر جاتا ہے اور بچھڑے کو ڈھونڈ نکالتا ہے جب اُسے ہانکتے ہوئے لا رہا ہوتا ہے تو پتوں کی چڑمڑاہٹ سن کر دونوں اطراف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے جو صبح تک جاری رہتی ہے۔ صبح پرمیت کور سنتا کی تلاش میں گھر سے باہر نکلی تو سامنے بچھڑا کھڑا تھا۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑی لیکن تبھی پولیس کی جیپ آ کر رُکی اور گولیوں سے چھلنی سنتا سنگھ کی لاش نیچے اُتار دی۔

یہ کہانی کنٹرول لائن کے دونوں اطراف رہنے والے افراد کے حالات پر پُرسوز تبصرہ اور فنی لحاظ سے انتہائی مضبوط افسانہ ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور اچھا افسانہ ''فاصلے'' ہے اس میں حاکم دین کا خاندان دونوں اطراف کے کشمیر میں سنتالیس میں تقسیم ہو گیا۔ حاکم دین اوڑی کی پہاڑیوں پر رہتا تھا اور اُس طرف کے لوگوں کی نقل وحرکت کو دیکھ سکتا تھا۔ البتہ اُن سے مِل نہ سکتا تھا۔ کئی بار مویشیوں کو چرانے والے کسان پاکستانی علاقے میں غلطی سے چلے جاتے تو وہاں کے رینجرز زیادہ باز پرس نہ کرتے اور اُنھیں واپس آنے دیتے۔

''ایک کنارے پر پاکستانی رینجروں کا قبضہ تھا اور دوسرے کنارے پر ہندوستانی افواج کا بیچ میں یہ جوندی بہتی تھی وہ آزاد تھی آج تک کوئی بھی ملک نہ اس کی روانی پر روک لگا پایا تھا اور نہ ہی اس کی سرکشی کو دبا پایا تھا۔۔۔ یہی حال پرندوں چرندوں کا تھا وہ جب چاہتے اِدھر سے اُدھر چلے آتے تھے۔ کوئی اُنھیں روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ اُن کے لیے نہ یہ سرحد کوئی معنی رکھی تھی نہ اُس پر پہرہ دینے والے۔ بس اگر ممانعت تھی تو وہ تھی انسانوں کو۔ شاید اس لیے کہ یہ فساد کی جڑ انسان ہی ہوتا ہے وہ جس قوم کا ہو یا جس ملک کا کیونکہ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب بھی اُس کی سرشت میں شامل ہے۔''(۲۲)

تبھی حالات زیادہ خراب ہو گئے اور سرحد پر پرندہ بھی پر مارتا تو فوجیوں کے درمیان گولا باری شروع ہو جاتی۔ حاکم دین کا بڑا بھائی جمال دین غلطی سے کنٹرول لائن عبور کر گیا۔ سال بھر گزر گیا اُس کی کوئی خبر نہ ملی تو سب نے سمجھا کہ مارا گیا۔ جمال دین کی بیوی زیتون کا نکاح چھوٹے بھائی حاکم دین سے کر دیا گیا جس میں سے ایک بیٹا بھی پیدا ہو گیا کہ ایک روز جمال دین اچانک واپس آ گیا وہ سرحد عبور کرنے کے جرم میں مظفر آباد میں دو برس قید

کاٹ کر کسی طرح واپس آ گیا تھا یہاں کے حالات دیکھے تو ناراض ہو کر واپس سرحد پار کر گیا۔ حاکم دین کو سخت افسوس ہوا اُس نے زیتون کو طلاق دے دی۔ اس اثنا میں حالات کچھ بہتر ہو گئے اور اوڑی کے پل سے بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے لیے بس سروس کا آغاز ہو گیا۔ حاکم دین بھی کاغذات بنوانے لگا کہ زیتون کو حاکم دین کے پاس چھوڑ آئے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بچے کو ماں سے الگ کیا جا رہا تھا کیونکہ وہ بھارت کا شہری تھا اور ماں کے ساتھ قانوناً نہیں جا سکتا تھا۔ زیتون شب بھر خدا کے سامنے روتی گڑگڑاتی رہی کہ اُسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے کہ اس کا لختِ جگر اُس سے جدا کیا جا رہا ہے۔ اُسی رات ہولناک زلزلہ آیا اور سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا اور جلال دین بھی اُسی زلزلے کی نذر ہو گیا۔ حاکم دین تو اپنا سر پیٹنے لگا لیکن زیتون بت بن کر کھڑی رہی۔ قسمت نے پھر اُسے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ گویا یہ دُکھیاری ماں جو شب بھر خدا کو پکارتی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا شکوہ کرتی رہی تھی۔ قہرِ خداوندی شاید جوش میں آ گیا اور انسانوں کے نافذ کیے گئے فیصلے چشمِ زدن میں تتر بتر ہو گئے۔ فرخ صابری اس افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں :

> ''(افسانے)، کی ابتدائی سطور میں تنازعۂ کشمیر کے حوالے سے جو وحشت ٹپکتی محسوس ہوئی وہ دُھند بعد ازاں چھٹتی چلی گئی کیونکہ افسانہ کسی ذہنی مریض سیاسی آدمی نے نہیں لکھا تھا۔ بلکہ ایک سچل افسانہ نگار نے یہ حقیقت سامنے رکھی کہ اس زمین کے چند مسائل کی کوکھ سے جنم لینے والے نام نہاد حل قدرت کی لائی ہوئی آفات کے ذریعے اپنی موت آپ ہی مر جاتے ہیں۔''(۲۳)

یہ دونوں افسانے تقسیم شدہ کشمیر کے دونوں حصوں میں رہنے والوں کا المیہ ہے جو اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو دُور دُور سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر مل نہیں سکتے جو اتنے قریب ہونے کے باوجود ملنے کی اُمید میں مرکھپ جاتے ہیں۔ لڑکیاں وہاں بیاہی جائیں تو عمر بھر میکے نہیں لوٹ سکتیں۔ ماں کے ساتھ چند مہینے کا بچہ نہیں جا سکتا کیونکہ وہ پاکستانی شہری نہیں ہے۔ کنٹرول لائین غلطی سے عبور کرنے والے واپس نہیں جا سکتے۔ کشمیر کے دونوں حصوں کے یہ بڑے مسائل ہیں جن پر مصنف نے قلم اُٹھایا ہے۔ مصنف کشمیر کے حالات کے متعلق لکھتا ہے :

> ''جو کم ظرف ہندو اور مسلمان کی راج نیتی چلا کر انسانوں کو بانٹنا چاہتے ہیں ان کے منہ پر اس سے بڑھ کر کراری چپت اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک مسلمان اگر میرا گھر اُجاڑتا ہے تو دوسرا اس پر مرہم لگاتا ہے۔''(۲۴)

دیپک کنول کی بیشتر کہانیاں اُن افراد کے گرد گھومتی ہیں جنھیں سری نگر یا جموں سے نقل مکانی پر مجبور کیا گیا۔ اس کا الزام وہ ملی ٹینٹ کے سر ڈالتے ہیں کئی کہانیوں میں یکطرفہ ہندووانہ مؤقف کو تو پیشِ نظر رکھا گیا لیکن اس

سوال کا جواب نہ دیا گیا کہ کشمیر میں تشدد اور احتجاج کی اصل جڑ کیا ہے۔اسی لیے اُن کے ہاں جذباتیت اور کرب کی کیفیت تو بہت ہے لیکن حالات کو سمجھنے کی غیر جانبدارانہ کوشش کی بجائے سطحی جذباتی انداز غالب آ جاتا ہے۔اُن کے دونوں مجموعوں کی اکثر کہانیاں اسی سوچ کی غماز ہیں۔

> ''زیرِ نظر مجموعے (برف کی آگ) کے سبھی افسانے کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے بیشتر دہشت گردی کا تناظر پیش کرتے ہیں۔۱۹۸۹ء میں افسانہ نگار نے خود اس دہشت گردی کو دیکھا ہے اور اسی کی وجہ سے ہجرت بھی اختیار کر لی پس اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ دیپک کنول کے کئی افسانوں میں مقصدیت صاف طور پر کارفرما ہے۔چونکہ افسانہ نگار رجائیت پسند اور روشن ذہن ہے۔اس لیے اُس نے اپنی تہذیب، مذہبی رواداری اور انسانیت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا ہے۔''**(۲۵)**

دیپک کنول کا بنیادی خیال یہی ہے کہ دہشت گرد پاکستان سے تربیت لے کر آتے ہیں جن کی کارستانیوں کی وجہ سے کشمیری پنڈتوں کو اپنا شہر چھوڑنا پڑا،لیکن اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ مقامی پولیس کا رویہ بھی ظالمانہ ہے اور مقامی عورتیں ان کی ہوس ناکی کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔اُن کے ہر افسانے میں دہشت گردی کے مناظر، پولیس کے مظالم اور وادی کی اس تباہی و بربادی پر دُکھ کا اظہار موجود ہے جس میں کشمیر کی محبت اور امن کی خواہش افزوں تر ہے۔

معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ترنم ریاض کا تعلق بھی کشمیر سے ہے لیکن نقل مکانی کر کے آج کل دلی میں سکونت پذیر ہیں۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی فضائیں اور دگرگوں حالات پوری طرح موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے اب تک چھپ چکے ہیں۔یہ تنگ زمیں''،''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''،''یمپرزل''،''نرگس کا پھول (یمپرزل)''،انتہائی نازک پھول ہے جو گرم ہوا کی تاب نہ لا کر برگ برگ جھڑ جاتا ہے۔ یہ پھول گویا کشمیر کی حسین وادی کا استعارہ بنتا ہے جو لخت لخت ہو چکی ہے اور جسے بادِ سموم جھلسا رہی ہے۔اُن کے دیگر مجموعوں کے عنوانات بھی وادی کے حوالے سے علامتی جہتیں واضح کرتے ہیں مثلاً''تنگ زمین'' اسی وادی کا اِستعارہ ہے جو آج اپنے مکینوں کے لیے تنگ ہو چکی ہے۔''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''انصاف کی خواہش کا استعارہ ہے کہ آخر ایک روز یہ ظلم کی آندھی تھم جائے گی۔غیرتِ خداوندی جوش میں آئے گی اور رُخصت ہو چکی ابابیلیں انصاف اور امن دلانے کو چونچوں میں کنکریاں بھر کر لوٹ آئیں گی۔

> ''ترنم ریاض نے کشمیر سے دُور دِلّی میں اپنا نشیمن تو بنا لیا ہے مگر ان کی سانسوں میں ابھی بھی اس دھرتی کی مہک سمائی ہوئی ہے۔موسم بہار کی آمد کا نصیب یمپرزل (نرگس) اسی بے لوث لگاؤ کا ثمر ہے۔یہ پھول بادِ سموم کی تاب نہ لا کر برگ برگ جھڑ

جاتا ہے۔ مذکورہ کہانی کشمیر کے المیہ کی داستان ہے۔ اسی وادی کی یادیں مجسمہ اور بالکنی میں ناسٹلجیا کا رُوپ دھار لیتی ہیں حالانکہ بیوی یا کسی اور انسان کا مجسمہ بنانا مسلمانوں میں جائز نہیں ہے پھر یہی زمین جب مکینوں پر تنگ ہو جاتی ہے تو معصوم بچے کھلونوں اور کھیل تماشوں کی بجائے ملی ٹینٹوں کا بہروپ بھرتے ہیں اور ان کی نقل کرتے ہیں۔ (یہ تنگ زمین)'' **(۲۶)**

ترنم ریاض کے ہاں وطن سے دُوری ایک بڑا دُکھ ہے اور پھر وطن پر ٹوٹنے والی قیامتیں دوسرا دُکھ ہے۔ پہلے دُکھ کا اظہار اُن کے ناول مورتی میں ان لفظوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ''اُس کی جڑیں تو اس زمین میں پیوست ہیں۔۔۔ دِل کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔۔۔ دیارِ غیر میں۔۔۔ نہ لوگ اپنے نہ زبان۔۔۔ نہ مٹی کی یہ خوشبو۔۔۔''

اُنھوں نے کئی افسانوں میں دہشت گردی کی حقیقت اور دہشت گردوں کی نفسیات کا تجزیہ بھی کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ جب کسی شخص پر اُس کی جائے پیدائش تنگ کر دی جائے تو پھر معصوم بچے بھی کھیل تماشوں اور کھلونوں سے دل بہلانے کی بجائے دہشت گردوں کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ تنگ زمین میں اُنھوں نے اس نظریے کو غیر جانبداری اور دلیری سے بیان کیا ہے۔ اُن کا افسانہ ''کھلونا'' بھی دہشت گردوں کی نفسیات کو سامنے لاتا ہے جس میں ایک پُروقار امیر عورت چار پانچ برس کے بچے کا ہاتھ پکڑے جوتوں والی دکان میں داخل ہوتی ہے۔ دُکان دار اُسے بڑی عزت دیتے ہیں وہ بچے کے لیے جوتے پسند کر رہی ہے۔ بچہ ماں کا دامن کھینچ کر کبھی ایک شلف کے پاس لے جاتا ہے کبھی دوسرا جوتا خریدنے کی ضد کرتا ہے کہ یکبارگی وہ خوبصورت معصوم بچہ انسانی بم بن کر پھٹ جاتا ہے نہ بچہ رہا نہ ماں نہ دُکان، گویا ترنم ریاض کے ہاں کشمیر پر ہونے والے ہتیہ چار کو اشارۃً کنایۃً پیش کیا گیا ہے اُن کے کئی اچھے افسانوں میں یہی خاموش احتجاج موجود ہے۔

افسانہ ''کشتی'' ایک ایسی عورت سے متعلق ہے جس کا شوہر ریاستی دہشت گردی کی نذر ہو چکا ہے وہ بچوں کو اکیلے چھوڑ کر اُسے ڈھونڈنے نکلتی ہے۔ بارش تیز ہے رات اندھیری ہے۔ بے یار و مددگار عورت ٹیلی فون بوتھ پر جا کر ٹیلی فون کرنا چاہتی ہے وہاں ایک فوجی پہلے ہی فون بوتھ کے پاس کھڑا ہے وہ اُس سے ڈرتی ہے اور اُس سے کسی بھی بُرے سلوک کی توقع رکھتی ہے لیکن غیر متوقع طور پر وہ مہربان نکلتا ہے۔ اُس کی سخت وردی کے اندر ایک نرم دِل موجود ہے۔ اس افسانے پر یہی تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ترنم ریاض کے ہاں عصری مسائل کشمیر کے المیہ واقعات خصوصاً ان کی زد میں آئی خواتین کی حالتِ زار اور وادی کی شکست و ریخت کو بیانیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مستعمل علامتیں اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہیں۔

کشمیری لال ذاکر ے/اپریل ۱۹۱۹ء بیگا بانیاں ضلع گجرات (پاکستان) میں پیدا ہوئے لیکن کشمیر سے قلبی وابستگی کی بنا پر کئی ناولٹس اور افسانے وادیٔ کشمیر کے پس منظر میں لکھے۔

''جب کشمیر جل رہا تھا'' اُس کے افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۴۷ء میں دلی سے چھپا۔ ''چنار چنار چہرے'' افسانوں کا مجموعہ ۱۹۹۴ء میں چھپا کشمیر کے پس منظر میں ہی برف، دھوپ چنار اور سمندری ہواؤں کا موسم ۲۰۰۵ء میں چھپے۔ سمندری ہواؤں کا موسم میں ایک کردار کہتا ہے :

> ''دونوں ملکوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی گئیں۔ دو جنگیں بھی ہوئیں۔ دہشت گردوں کی کارروائیاں تیز سے تر ہوگئیں اور اب وادی میں ہندو آبادی صرف نام کو ہی رہ گئی تھی۔ ہجرت کا یہ موسم ایک دم خزاں کا موسم تھا۔ ہم نے کشمیر کی وادی میں جتنی بہاریں دیکھی تھیں اور جتنے پھولوں کا نظارہ کیا تھا وہ تو سب ماضی کے اوراق میں بدل گئے تھے پشکر ناتھ کہا کرتا تھا کہ اننت ناگ کی سڑکوں پر گھنے چناروں کے پتے اب سرخ انگاروں میں تبدیل ہوگئے تھے۔۔۔ خزاں کے دن تھے لیکن دل کے زخموں پر بہار تھی یہ وہ اذیت تھی جس کا ہم ہجرت زدہ لوگوں کو دن رات سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔'' **(۲۷)**

اس دُکھ میں مصنف نے ناول ''آدھے چاند کی رات'' اور کئی افسانے تحریر کیے، انھوں نے اپنے افسانے ''بہن اور ماں'' میں اپنے سوانح کو افسانے کی صورت دی ہے۔ مصنف نے اپنی ماں پر میشوری کو ماں اور بہن کے رشتوں میں تقسیم ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ علاوہ ازیں کشمیر میں جاری ظلم کے مناظر بھی پیش کیے ہیں۔ مصنف پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور شیخ عبداللہ سے سوال کرتا ہے کہ اگر بھارتی فوجیوں کو کشمیر سے نکال بھی دیا جائے تو بھی جو افراد ان کی گولیوں کا نشانہ بنے وہ واپس تو نہ آ سکیں گے یہ افسانہ خط کی تکنیک میں لکھا گیا اچھا افسانہ ہے، لیکن ان حالات کے پس منظر کا تجزیہ کہیں بھی غیر جانبداری سے نہ کیا گیا۔ کشمیر کے حسین مناظر کی یادیں ہیں اور ہجرت کا کرب ہے۔ وادی میں پھیلی خوں ریزی اور تباہی کے مناظر ہیں لیکن کشمیریوں کے حقوق اور آزادی کی آواز اتنی زیادہ کہانیوں میں سے سنائی دیتی ہے۔ ہاں البتہ وادی کی خونچکاں حالتِ زار کا ذِکر انتہائی کرب کے ساتھ موجود ہے۔

> ''وادی میں اُس کے باسی ایک غمزدہ ماحول میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اُن کی سماجی زندگی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے غم ہیں کہ برداشت سے باہر ہیں۔ افراد اس تباہ حال معاشرے میں نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ عزتیں محفوظ نہیں۔ (الزامات، انتظامیہ اور انتظامیہ مخالف دونوں قوتوں پر ہیں) روزگار برباد ہو چکے ہیں۔۔۔ افراتفری، ابتری اور مایوسی نے وادی کا حسن گہنا دیا ہے اور اس کی دلدوز چیخیں کشمیر کے افسانوی ادب سے سنائی دیتی ہیں۔ افسانے وہاں ہونے والی بے انصافی، ظلم اور شیطانی عملوں کی عکاسی تو بخوبی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک تاریخ کے لیے یہ واضح ثبوت نہیں چھوڑ رہے کہ زیادتی کس کی طرف سے ہو رہی ہے۔'' **(۲۸)**

کشمیر کے ہندوستانی انتظام والے حصے میں اُردو افسانہ دو واضح اور الگ الگ نقطۂ نظر کا حامل نظر آتا ہے۔ وہاں کچھ افسانہ نگار ہیں جو کشمیر کی سیاسی ناپائیداری، ناانصافی، رشوت خوری، بے روزگاری، کرفیو، ہڑتالوں اور ایمرجنسی کے نفاذ، پولیس اور فوجیوں کی طرف سے ڈھائے گئے مظالم، عصمت دری، لوٹ مار جیسے موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔ ان میں نور شاہ، ترنم ریاض، عمر مجید، منظورہ اختر، زاہد مختار اور نکہت نظر جیسے ادیبوں نے فکر انگیز افسانے تحریر کیے۔ مثلاً منظورہ اختر کے دو افسانے کشمیری پنڈتوں کی ایجی ٹیشن پر ''پاکیزہ سہارا'' اور ''جیون ساتھی'' رقم کیے۔ آنند لہر اور خالد حسین نے سرحد کے قریبی رہنے والے باشندوں کی خوفزدہ زندگی اور آئے روز کی کراس فائرنگ کا شکار ہونے والوں کی نفسیاتی کشمکش کو موضوع بنایا۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں اکثریت مسلمان ادیبوں کی ہے جب کہ ویریندر پٹواری، دیپک کنول، دیپک بدکی جیسے افسانہ نگاروں نے کشمیری پنڈتوں کی دربدری اور بے گھری پر افسانے لکھے اور سوال اُٹھایا ہے کہ ان کے لیے آبائی وطن میں رہنا ناممکن کیوں بنا دیا گیا ہے۔ فرخ صابری لکھتی ہیں:

> ''دیپک کنول کے افسانوں ''برف کی آگ'' کے حوالے سے کشمیری افسانوی ادب میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ کشمیر کے پُرآشوب دور کے حوالے سے جب تاریخ میں سوال اُٹھے گا کہ کشمیر کے اصل باشندے یعنی کشمیری پنڈت خود اپنی دھرتی سے نیست و نابود کیوں ہو گئے۔ تو کنول کے افسانے آنے والی پیڑھیوں (نسلوں) کو جواب فراہم کریں گے۔''**(۲۹)**

کاش اس سوال کا جواب غیر جانبدارانہ دیا جاتا کہ کشمیر کے قدیمی اور اصل باشندے جن میں اکثریت غریب مسلمانوں کی ہے۔ اُن کی آزادی اور بنیادی حقوق کو کس نے غصب کیا لیکن اکثر افسانہ نگار اس پہلو پر خاموشی اختیار کر جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ دیپک بدکی، عصری تحریریں، سری نگر: میران پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۷

۲۔ حقانی القاسمی، ویریندر پٹواری، مشمولہ: عصری تحریریں (تنقیدی مضامین و تبصرے)، مرتبہ: دیپک بدکی، سری نگر: کشمیر، میزان پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۶

۳۔ وریندر پٹواری، قیدی اُفق، دہلی: ڈیلکس اپارٹمنٹس، ۲۰۰۳ء، ص ۹۷

۴۔ وریندر پٹواری، ڈر، اُفق، ص ۹۷

۵۔ نور شاہ، وریندر پٹواری، ایضاً، ص ۶۱

۶۔ بحوالہ دیپک بدکی، رسالہ ''اسباق'' پونا: جولائی۔ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۴۸

۷۔ سلطانہ مہر، وادیٔ کشمیر کا افسانوی ادب، مشمولہ: تخلیق، ماہنامہ، ستمبر، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵
۸۔ نسرین نقاش، اسباق، پونہ، جولائی ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۵۴
۹۔ فرخ صابر، لاکھوں مقہوروں کی دلدوز چیخ، مشمولہ: سیارہ ڈائجسٹ، لاہور: جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۴۔۲۰۳
۱۰۔ نور شاہ، اس کمرے کی کھڑکی سے، مشمولہ: رسالہ حکیم الامت، بڈگام: نومبر ۲۰۰۷ء، ص
۱۱۔ نور شاہ، لکیریں، مشمولہ: بے ثمر بیج، حضرت بل: سری نگر، امیکس بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۸۵
۱۲۔ نور شاہ، بے ثمر بیج، حضرت بل: سری نگر، امیکس بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۷
۱۳۔ فرخ صابری، وادیٔ کشمیر کا افسانوی ادب لاکھوں مقہوروں کی دلدوز چیخ، مشمولہ سیارہ ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۰۹، ص ۲۰۵
۱۴۔ سیفی سرونجی، پمپوش (دیباچہ)، مشمولہ: پمپوش، مرتبہ: دیپک کنول، دہلی: راہی کتاب گھر، ۲۰۱۱ء، ص ۷
۱۵۔ دیپک کنول، پمپوش، مشمولہ: پمپوش، دہلی: راہی کتاب گھر، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۰
۱۶۔ دیپک کنول، بانگی مرغا، مشمولہ: پمپوش، ص ۹۱
۱۷۔ ایضاً، ص ۹۲
۱۸۔ دیپک کنول، سنتا کی گوری، ص ۱۱۱
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۹
۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۹
۲۲۔ دیپک کنول، فاصلے، ایضاً، ص ۱۳۴۔۱۳۳
۲۳۔ فرخ صابری، وادیٔ کشمیر کا افسانوی ادب، لاکھوں مقہوروں کی دلدوز چیخ، ص ۲۰۱
۲۴۔ دیپک کنول، برف کی آگ، ایضاً، ص ۱۵
۲۵۔ دیپک بدکی، عصری تحریریں (تنقیدی مضامین وتبصرے)، سرینگر: کشمیر، میزان پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۹۰
۲۶۔ ایضاً، ترنم ریاض، تنگِ زمین، ص ۹۲
۲۷۔ نند کشور وکرم، کشمیری لال ذاکر فن وشخصیت، دہلی: عالمی اُردو ادب، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، ص ۵۹
۲۸۔ فرخ صابری، وادیٔ کشمیر کا افسانوی ادب، مشمولہ: تخلیق، لاہور: ۲۰۰۹ء، ص
۲۹۔ ایضاً، ص ۲۰۹